Taraqqi Pasand tahreek ke daur urdu shayeri ka jayeza

B.A Urdu (Hons)

Lecture-1

ترقی پسند شعراء میں ساحر، فیض، مجروح، احمد ندیم قاسمی، عدم، جانثار اختر اور علی سردار جعفری وغیرہ کے نام اہم ہیں۔ جنہوں نے غزل کو ریختہ سے بھی منسوب کیا ہے۔ سوال یہ ہے کہ ریختہ لفظ غزل کے لیے کیوں رائج ہو۔ اس کے اسباب کیا تھے۔ یہ لفظ اولین کون سی غزلوں کے لیے مستعمل تھا۔ ان سوالات کا جواب محمود شیرانی نے اپنی کتاب 'پنجاب میں اردو' میں اس بات کی صراحت کے ساتھ وضاحت کی ہے۔ محمود شیرانی نے موسیقی کی اس نئی اصطلاح کی تلخیص میں حضرت علاؤالدین ثانی برناوی کی تصنیف کتاب چشتیہ کے حوالے سے لکھا ہے ۔''اس اصطلاح سے موسیقی میں یہ مقصد قرار پایا کہ جو فارسی، خیال ہندوی کے مطابق ہو اور جس میں دونوں زبانوں کے سرود ایک تال اور ایک راگ میں بندھے ہوں، اس کو ریختہ کہتے ہیں۔ ریختہ کے لیے کسی پردے کی قید نہیں ہے۔ وہ ہر پردے میں باندھی جاتی ہے۔ 'محمود صاحب نے ریختہ کی اصطلاح پر موسیقی کے قاعدوں کے اعتبار سے کوئی خاص تحقیق نہیں کی وہ موجود کلام کے نتیجے پر یہ کہتے ہیں ریختہ اک ایسے نمونہ کلام کا نام ہے جس میں فارسی اور ہندوی کلام کی آمیزش ہو اور اسی ترتیب میں پرویا گیا ہو۔ متذکرہ معلوم کے نتیجہ پر پہنچنے سے قبل ہمیں امیر خسروؒ کی اس اصطلاح ریختہ پر غور کرنا ہو گا کیوں لفظ ریختہ کا استمال کیا گیا تھا۔ محمود شیرانی نے جن غزلوں کو ریختہ کے طور پر پیش کیا ہے اُن کی بحریں یہ ہیں:

مصرع: زحالِ مسکیں مکن تغافل ورائے نیناں بنائے بتیاں

بحر: مفاعلاتن مفاعلاتن مفاعلاتن مفاعلاتن

مصرع: سعدی کہ گفتہ ریختہ در ریختہ در ریختہ

بحر: مستفعلن مستفعلن مستفعلن مستفعلن

مصرع: سن لے یشودارانی تو لال کی بڈائی

بحر: مفعول فاعلاتن، مفعول فاعلاتن

مصرع: سوکھ چین کے منڈل موں، سبھ جا کرو پکارا

بحر: مفعول فاعلاتن، مفعول فاعلاتن

یہ تمام بحریں شکستہ ہیں۔ موجودہ معلوم کی روشنی میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ ریختہ اول اول میں اس کلام کو کہا گیا ہو گا جس میں بحر کے اعتبار سے شکستن اور ریختن کے عناصر پوری طرح کارفرما نظر آئیں ہوں۔ لفظ ریختہ پر مسلسل بحث کی ضرورت ہے کیوں کہ اس کی وضاحت محمود صاحب نے بھی ادھوری چھوڑی ہے۔ اسی لیے ہم نصیر الدین ہاشمی کو ریختہ بمعنی غزل کے لیے اردو میں اپنی تحقیق کا بنیادی رکن بنایا جائے تو ریختہ کو ولی نے ۱۷۰۰ء کے بعد یعنی اٹھارہویں صدی کے بالکل آغاز میں اپنے سفر دہلی کے بعد گجرات یا دکن میں غزل کے طور پر استعمال کیا ہو گا۔ ولیؔ نے ریختہ کے لیے نہ تو شکستہ بحر کی کوئی شرط ملحوظ رکھی ہے۔ نہ ہی فارسی اور ہندی کلام کی آمیزش کی کوئی بندش خود پہ لگائی ہے اور مزید دلچسپ بات یہ ہے کہ اس نے اپنے کلام کو ریختہ کا نام دینے میں بھی کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کی ہے۔ ثبوت میں یہ شعر ملاحظہ ہو:

امید مجھ کوں یوں ہے ولیؔ کیا عجب اگر؛ اس ریختے کو سن کے ہو معنی نگار بند

یہاں پر سب سے ضروری بات یہ ہے کہ ریختہ کی جگہ غزل نے کیوں لی؟ جب کہ غزل کی اصطلاح شاعری میں موجود تھی تو پھر ریختہ کی ضرورت کیوں ہوئی۔ کن وجوہات کی بنا پر ریختہ لفظ کو غزل میں تبدیل ہونا پڑا۔ یا ہو سکتا ہے ریختہ کسی ایسی صنفِ سخن کا نام تھا جس کے قواعد غزل سے الگ تھے۔ اٹھارہویں صدی عیسوی کے وسط میں میر کے ریختہ سے متعلق بیانات کو محمود شیرانی ان کی ذہنی اُپج قرار دیتے ہیں۔ میر نکات الشعرا کے خاتمے میں ریختہ کی تعریف میں لکھتے ہیں کہ ''اول آنکہ یک مصرعش فارسی و یک ہندی چنانچہ قطعہ حضرت امیر خسرو علیہ الرحمۃ نوشتہ شد دویم آنکہ نصف مصرعش ہندی و نصف فارسی چنانچہ شعر میر معز (موسوی مرقوم) سویم آنکہ حرف و فعل فارسی بکار می برند وایں قبیح است چہارم آنکہ ترکیباتِ فارسی می آرند۔'' اگر یہاں غور کریں تو معلوم ہو گا کہ ریختہ کی یہ جو شرطیں میر نے بیان کی ہیں اُن پر خود اُن کا وہ کلام پورا نہیں اُترتا۔ ثبوت میں یہ اشعار ملاظہ فرمائیں:

پڑھتے پھریں گے گلیوں میں ان ریختوں کو لوگ؛ مدت رہیں گی یاد یہ باتیں ہماریاں

کس کس طرح سے میرؔ نے کاٹا ہے عمر کو؛ اب آخر آخر ان کنے یہ ریختہ کہا

سرسبز ملک ہند میں ایسا ہوا کہ میرؔ؛ یہ ریختہ لکھا ہوا تیرا دکن گیا

ریختہ رتبے کو پہنچایا ہوا اس کا ہے؛ معتقد کون نہیں میرؔ کی استادی کا

دل کس طرح نہ کھینچیں اشعار ریختہ کے؛ بہتر کیا ہے میں نے اس عیب کو ہنر سے

میرؔ کس کو اب دماغِ گفتگو؛ عمر گزری ریختہ چھوٹا گیا

مندرجہ بالا اشعار میں بھی اگر ریختہ کا لفظ نظر انداز کر دیا جائے تو میر کے یہ شعر آسان ہندوی زبان کے ہیں جن کا اُن تمام شرطوں سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ جن کو خود میرؔ نے بیان کیا ہے۔ اس پر سب سے قبل اردو کے دانشور محقق شمس الرحمان فاروقی نے اپنی کتاب ''اردو کا ابتدائی زمانہ'' میں دہلی میں ریختہ اور غزل کی مناسبت پر اپنے اظہار خیال کچھ اس طرح کیا ہے۔ ''فارسی کی طرف جھکاؤ اور فارسی (یا سبک ہندی) کی غیر معمولی توقیر و مقبولیت کا ایک ثبوت اس بات میں بھی ملتا ہے کہ دلی والے عرصۂ دراز تک 'غزل' اور

'ریختہ' میں فرق کرتے رہے۔یعنی وہ ریختہ میں کہی ہوئی غزل کو غزل نہیں صرف ریختہ قرار دیتے تھے۔غزل کی اصطلاح صرف فارسی غزل کے لیے تھی۔ '' اس بیان کا مآخذ قائمؔ اور مصحفیؔ کے ان اشعر میں دیکھا جا سکتا ہے:

قائم میں غزل طور کیا ریختہ ورنہ؛اک بات لچر سی بہ زبانِ دکنی تھی

مصحفی ریختہ کہتا ہوں میں بہتر ز غزل؛معتقد کیونکے کوئی سعدیؔ و خسروؔ کا ہو

مصحفیؔ کے ان اشعار سے صاف معلوم ہوتا ہے انہوں نے ریختہ اور غزل کی لفظی مناسبت کا اہتمام کیا ہے۔کیوں کہ ان اشعار میں ریختہ اور فارسی غزل کو غزل سے پکارا ہے۔متذکرہ اردو غزل کی تاریخی مطالعہ کی روشنی میں ہم یہ کہی سکتے ہیں کہ غزل لفظ سے صرف فارسی غزل مراد لیتے تھے۔ریختہ اور غزل پر ہونے والی اس گفتگو سے معلوم ہوتا ہے پچھلے تمام شعراء ریختہ کو مذکر ہی سمجھتے ہیں اور اسے ہمارے کلاسیکل شعرا نے زیادہ تر مذکر ہی باندھا ہے۔لیکن ایسا نہیں ہے۔اٹھارہویں صدی عیسوی کے اوائل میں لفظِ ریختہ جہاں ایک طرف اپنے لغوی اور اصطلاحی معنی کی تشکیل میں گم تھا وہیں اس کے مذکر اور مؤنث ہونے پر بھی اختلافات تھے اس ضمن میں جرأت کا یہ شعر ملاظہ ہوں:

کہہ غزل اور اس انداز کی جرأت اب تو؛ریختہ جیسے کہ اگلی تری مشہور ہوئی

جرأت نے جس لفظِ ریختہ کو موئنث استعمال کیا ہے اس کی تاریخ بڑی عجیب اور دلچسپ ہوگی۔اس لفظ کا استعمال بارھویں صدی ہجری کی ابتدا سے تیرھویں صدی کے آخر تک ہوتا رہا اور غالب اور ان کے معاصرین کے یہاں بھی اس لفظ کو اردو غزل کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔۱۹۸۰ء کے بعد ایک طرف تو جدید تر طرز احساس اور پیرائیہ اظہار نے غزل کو فکری اور فنی حوالے سے توانائی عطا کی اور اس میں عہد رواں کا رنگ رَس شامل کر کے اسے نئے امکانات کی بشارت دی۔دوسری طرف اس عہد میں غزل کی ہیئت کو جامد قرار دے کر نئے ہیتی تجربات کا ڈول ڈالا گیا۔ان تجربات کے نتیجے میں آزاد غزل، معریٰ غزل اور نثری غزل جیسے ہیتی ڈھانچے وجود میں آئے۔بقول پروفیسر وہاب اشرفیؔ ''ہر زمانے کے ادب پر مابعد جدیدیت کے نقطۂ نظر سے بحث ہو سکتی ہے، بلکہ ہو رہی ہے، اس لئے کہ اس کے تمام نکات واضح طور پر کسی ایک عہد، زمانے یا رجحان میں قید نہیں، بلکہ یہ زمان و مکان کے بے حد وسیع تناظر میں اپنا کام سرانجام دیتے ہوئے نظر آتی ہے''۔بالخصوص ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی کا خیال ہے'' ناسخ سے پہلے اردو زبان اور غزل دونوں کو ریختہ کہتے تھے۔ناسخ نے غالباً سب سے پہلے زبان اور غزل کو علیحدہ علیحدہ اردو اور غزل کے نام سے رواج دیا۔۔۔غزل میں عاشقانہ جذبات کے علاوہ دوسرے مضامین ادا کرنے کی تذکیر وہ تانیث کے قواعد مرتب کیے۔ردیف اور قوافی کے اصول بنائیں۔ان تمام امور کو ملحوظ رکھیں تو ناسخ کو شعرائے لکھنو کا استاد کہنا بے جا نہیں ہے۔''اسی طرح کا ایک شعر نظیر اکبر آبادی کا ایک شعر ثبوت کے طور پر ملاحظہ فرمائیں:

عشق بھلا ہے تجھے زلف بتاں کی قسم؛ہجر کی شب سے کوئی شب ہے بڑی اور بھی

اس شعر میں '' منکاڈھلا'' بڑا حسین محاروہ ہے اور آخر میں ''بھلا'' کا استعمال بڑا اندر اور نظیر کے حصے کی چیز ہے۔ نظیر کی غزلوں میں لگاوٹ، چوچلے اور چھیڑ چھاڑ کا مزہ بھی موجود ہے۔ معاملہ بندی میں بھی اسے پورا کمال حاصل ہے۔ رازو نیاز کا بھی سچا مصور ہے۔ اس پر طرہ یہ ہے کہ یہ سارے جزنیات بلکہ کسی تصنع اور خارجی آمیزش کے فطری سادگی کے ساتھ غزل کے قالب میں ڈھلے ہوئے میسر آتے ہیں ردیف میں نظیر کی غزل کو جرأت اور انشا کی غزلوں پر کھلی ہوئی فوقیت ہے.

Dr. H M Imran

Assistant professor,

S S College, jehanabad

Imran305@gmail.com